جدیدیت، تجدید، تجدد، مغرب اور اسلام (۲)

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

تغیر اور تبدیلی ایک ایسا فطری عمل ہے جسے خود قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں جا بجا ذکر فرمایا ہے۔ بطور ایک خبر کے بھی اور بطور عبرت کے بھی۔ چنانچہ اقوام عالم کے عروج و زوال، قیادت پر فائز یا معزول کیے جانے کو قرآن کریم میں آفاقی اخلاقی ضابطہ کے طور بیان کیا گیا ہے، ''یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں''، (آل عمران ۳ : ۱۴۰)۔ قرآن کریم کے اس آفاقی اخلاقی ضابطہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے ساتھ تبدیلی و تغیر کے لیے انسانوں کے اپنے طرز عمل اور اکتساب کو بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ انسانی میں تبدیلی اسی وقت واقع ہوتی ہے جب افراد میں حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے نفوس، افکار و اعمال میں تبدیلی کے ذریعہ قومی اور عالمی سطح پر قیادت کا کردار ادا کرنا چاہیں۔ اس اصول کو مزید وضاحت کے ساتھ ایک اور مقام پر یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ ''یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے'' (الانفال ۸ : ۵۳)

تغیر و تبدیلی کا قرآنی تصور انسان کو اس کی قوت ارادی اور صلاحیت عمل کی بنا پر زمان و مکان میں مقام قوامیت عطا کرتا ہے۔ گویا انسان تاریخ کی پیداوار یا غلام نہیں ہے بلکہ تاریخ ساز ہے۔ اس کے برعکس مادی تعبیر تاریخ، انسانی معیشت، معاشرت، سیاست، ثقافت حتیٰ کہ ''مذہب'' کو بھی مادی جدلیاتی عمل کے زیر اثر ایک تاریخی عمل کی پیداوار (Product) قرار دیتی ہے۔ منطقی طور پر تاریخ کی اس تعبیر میں انسان کا معاشرتی اور معاشی عمل، جسے کمتر سے بہتر کی طرف ایک سفر تصور کر لیا گیا ہے، یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نقش کہن کو خواہ وہ مذہب ہو، ثقافت ہو، اخلاق ہو، معیشت و معاشرت اور سیاست ہو، زمان و مکان میں تبدیلی و ترقی کے ساتھ منسوخ و معدوم ہو جانا چاہئے۔

اس تاریخی تناظر میں جب یورپ نے اپنے تاریک جاہلی دور سے مقابلتاً کم تاریک جاہلی دور میں قدم رکھا تو نشاۃ ثانیہ اور تجدد کی تحریک نے ماضی کی تمام روایات بالخصوص عیسائی مذہب کو فرسودہ، ناقابل عمل، ماضی پرست اور غیر عقلی قرار دیا اور جدید جاہلی انسان کو آزادی کا پیغام سناتے ہوئے رواداری و ترقی کے دور کے آغاز کا مژدہ سنایا۔ اب ایک Liber-al 'انسانیت دوست'' تہذیب کا دور شروع ہوا، جسے Modern قرار دے دیا گیا اور Modern-ism کے زیر عنوان ماضی کی ہر روایت کو نشانہ جراحت بناتے ہوئے ہر شعبہ حیات میں فرد کی آزادی کو اپنا منشور قرار دیا، یعنی فرد جو چاہے، جس طرح چاہے اور جب چاہے اپنے لیے ضابطہ حیات تجویز کرے۔

جدیدیت پر، جدید جاہلی تہذیب کے انسان کا یہ ناز زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا اور بیسویں صدی تک سفر کرتے کرتے اس پر یہ راز کھلا کہ جس چیز کو جدیدیت Modernism قرار دیا گیا تھا وہ بھی اضافی ہی تھی، مستقل نہ تھی۔ اس لئے اب Post-Modernism کے زیر عنوان ایک نئے سفر کے آغاز کی ضرورت محسوس کی گئی۔

دوسری جانب گزشتہ دو سو سال کے عرصہ میں مسلم آبادیوں پر مغربی استعمار، ثقافتی یلغار اور خود مسلم آبادیوں کے فکری جمود کے نتیجہ میں مغرب کے لادینی تعلیمی نظریات اور طبقاتی نظام کے زیر اثر ذہنی طور پر محکوم ایک ایسی پوری نسل وجود میں آگئی جس نے مغربی اقدار حیات، معیار حق و باطل، ثقافتی رجحانات اور علمی روایت کو صحیفہ آسمانی سمجھتے ہوئے اپنے قلب و نظر کا حصہ بنالیا اور مغربی تعبیر تاریخ کی روشنی میں اسلام کو بھی ساتویں صدی میں منظر عام پر آنے والا ایک ''مذہب'' تصور کرتے ہوئے معاشرتی، سیاسی اور معاشی و قانونی معاملات کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا کہ وہ رسوم و رواج جو ماضی میں ایک ''بدویانہ'' ثقافت کی پیداوار تھے، آج کیوں اختیار کیے جائیں؟ کیا حجاب جیسی ''دقیانوسی'' روایت کو جسے اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے نہ صرف ضابطہ لباس بلکہ ضابطہ اخلاق قرار دیا اسے آج بھی اختیار کیا جائے گا؟ ایسا کرنا علامتی طور پر رجعت پسندی ہوگا یا تحریر المرۃ کی علامت قرار دیا جائے گا؟ سیاسی، قانونی اور معاشی دائرہ کار میں کیا خلافت کے قیام کے بغیر کوئی نظام اسلامی نہیں کہا جاسکے گا؟ اور کیا آج معاشی ترقی کے لیے، جس کی بنیاد سود کو قرار دیا جاتا ہے، قرآن کی معاشی تعلیمات پر عمل کیا جاسکے گا، کیا قرآن و سنت کے قوانین جو بظاہر ساتویں صدی میں منظر تاریخ میں آئے، تبدیلی زمانہ کے باوجود آج کے سنجیدہ معاشی و سیاسی حالات میں رائج کیے جاسکیں گے؟

ان سوالات کو اٹھانے والا ذہن چاہے مغرب کا مکمل غلام اور تابع فرمان ہی کیوں نہ ہو اور چاہے اس کا تصور تاریخ مطلقاً باطل اور محدودیت کا شکار ہی کیوں نہ ہو، ان سوالات کا اٹھایا جانا ایک قابل تحسین عمل ہے، بلکہ اقتضائے شریعت ہے۔ قرآن وحدیث کی اصل روح وہ حریت ہے جس میں ایک فرد اپنی ذہنی روایت کی غلامی سے نکل کر معروضی طور پر خود اپنے معتقدات، رسوم و رواج اور طرز عمل کا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ کہاں تک حق، عدل اور عقل کے تقاضوں کی پیروی کر رہا ہے۔ قرآن وحدیث نے ہر ہر معاملہ میں خواہ وہ عقیدہ کا ہو، عائلی نوعیت کا ہو، فوجداری، معاملات سے تعلق رکھتا ہو، غرض نوعیت مسئلہ کچھ بھی ہو تعقل، تفکر، تدبر، تحقیق، تجزیہ و تحلیل کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس لیے یہ سوالات بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں۔

البتہ ان سوالات کے جوابات قرآن وسنت میں تلاش کرنے کی بجائے یہ مفروضہ اختیار کرنا کہ اسلام کا عائلی نظام ''فرسودہ'' ہو گیا اب اس کی جگہ برطانوی، فرانسیسی، ڈچ یا اطالوی قوانین نافذ کر کے جدیدیت کو اختیار کیا جائے، واضح طور پر غلامانہ ذہن وروح کا پتہ دیتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ ایک سادہ اور چھوٹی سی بات جو مغرب زدہ افراد اور مغرب کے خاصے معقول ذہن میں نہ سما سکی، یہ ہے کہ دنیا کی تمام ثقافتوں، تہذیبوں اور ''مذاہب'' کو ایک محدود پیمانہ پر جانچنا نہ عقلی ہے نہ منطقی۔ اگر بعض مذاہب میں تغیر و تبدیلی کے عمل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور وہ جامد تقلید اور اندھی پیروی کا شکار ہوئے تو ضروری نہیں کہ ہر نظریہ حیات کے خمیر میں یہ خامی پائی جائے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جدید مسائل کے حل اور اسلام کے آفاقی وابدی اصولوں کو نئے حالات میں نافذ ورائج کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی حیات مبارکہ میں ایک ایسا اصول تعلیم فرما دیا تھا جو عبادات، معاملات، قانون واقتصادیات غرض ہر شعبہ حیات میں پیش آنے والے مستقبل کے مسائل کو جدید مطالبات کے پیش نظر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس اصول کو حدیث شریف میں اجتہاد کا نام دیا گیا ہے۔

اسلام کی فکری اور علمی تاریخ میں اجتہاد کا اصول کسی ایسے دور کی پیداوار نہیں ہے، جس میں اچانک عقلیت پرستی کے فروغ کی بنا پر چند علماء و فلاسفہ نے اپنی دانشمندی اور دانشوری کے سہارے اس کا سراغ لگا لیا ہو بلکہ اس کی تعلیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت ایک مشہور حدیث میں فرمائی اور قیامت تک کے لیے اسلام میں تجدید اور جدید مسائل کے حل کی صلاحیت و حکمت عملی کو

متعین فرمادیا۔

جب امت مسلمہ نے اس ابدی اصول کی حقیقت کو سمجھا اور استعمال کیا تو وہ طب، کیمیا، طبعیات، ہندسہ، فقہ، فلسفہ اخلاقیات، ادب، غرض ہر شعبہ علم میں وہ علمی انقلاب لائی جس پر آج تک انسانی تہذیب و ثقافت فخر کرتی ہے۔ لیکن جب اپنی تنگ نظری اور بالخصوص دین و دنیا میں تفریق کے لادینی بیرونی تصور کے زیر اثر اس نے اجتہاد کے دائرہ کار کو محض شخصی معاملات اور طہارت کے مسائل میں محدود کر لیا اور سیاسی، معاشی، علمی معاملات میں وقت کے نظریات کی پیروی کو اپنا ذریعہ نجات سمجھا تو اجتہاد کا عمل خود بخود رک گیا۔

اسلامی روایت اجتہاد سے یہ انحراف ترقی و تجدید کے اُس عمل کو، جو اسلام کی روح ہے اور جس کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن نے اجتہاد کے اصول کو مرکزی قرار دیا تھا، معطل کرنے کا باعث بنا۔ اس جمود و تعطل سے نجات کس طرح ہو؟ کیا اس کا حل مغربی فکر کو بنیاد بناتے ہوئے اسلام کی تعلیمات میں سے ایک انتخاب کرنا ہے یا مسلمانوں کے ادوار ملوکیت و سلطانی میں اب سے سینکڑوں سال قبل تیار کیئے گئے فتاویٰ اور قوانین کا اجراء و نفاذ کرنا ہے؟ ظاہر ہے کوئی شخص جو تھوڑی سی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہو، یہ بات باور نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے بعض سلاطین اور ملوک کے دور کے فتاویٰ کو جدید حالات و مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے جوں کا توں ''نفاذ شریعت'' کے عنوان سے نافذ کر دیا جائے۔ مسئلہ کا اصل حل اجتہاد کے مسنون اصول کو اس کی مکمل شکل میں اختیار کرنا ہے۔ یعنی اجتہاد کو محض چند ذاتی مسائل تک مقید و محدود نہ کر دیا جائے بلکہ وسیع تر دائرہ کار میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

اجتہاد کا کلی طور پر اختیار کرنا، وہ کلیدی فکر ہے جسے بیسویں صدی میں تحریکات اسلامی نے اپنی نظریاتی اساس قرار دیا۔ تحریکات اسلامی کی طرف سے تجدید و احیائے دین کی پکار ہو، ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت کا احساس ہو یا اقامت دین کی دعوت، عملی طور پر جائزہ لے کر دیکھا جائے تو ان سب کی بنیاد صرف اور صرف ایک خواہش نظر آتی ہے یعنی زندگی کے تمام معاملات میں روحِ اجتہاد کو اختیار کرنا۔

اس خواہش کے اظہار کے لیے تحریکات اسلامی نے جو لہجہ اور زبان اختیار کی وہ اسلامی ثقافتی روایت کی روشنی میں قرآن و سنت سے مستعار اصطلاحات پر مبنی ہے یعنی حاکمیت الٰہیہ کا قیام، تزکیہ نفس، تعمیر سیرت و شخصیت اسلامی، اصلاح اُسرہ و معاشرہ، فکری تطہیر، تزکیہ مال و اقتصاد، قیام حکومت اسلامیہ اور معاشرتی و سیاسی حقوق و فرائض کی ادائیگی جبکہ مغرب زدہ ذہن اور مغربی سامراج نے اس کا مطلب یہی لیا کہ تحریکات اسلامی آنکھیں بند کر کے ایک ایسا

انقلاب لانا چاہتی ہیں جس میں ''ماضی'' کی اقدار مثلاً دور مغلیہ، دور مملوک یا دور سلاطین میں رائج قوانین فتاوی کو نافذ کیا جا سکے۔

ہمارے خیال میں اجتہادی تحریکات اسلامی کے حوالے سے یہ غلط فہمی اتنی ہی بڑی ہے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) جتنی مغرب کے بارے میں ہماری یہ غلط فہمی کہ مغرب میں پائی جانے والی ہر ہر فکر لازمی طور پر لادینیت، شرک اور عدم توازن کی علمبردار ہے۔ اس غلط فہمی کی اصلاح جتنی جلد ہو اتنی ہی جانبین کے درمیان معقول و معتدل تبادلہ خیالات و رابطہ کے لیے مفید ہو گی۔ اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ ہے کہ کم از کم تحریکات اسلامی کے صحیح خدوخال خصوصاً جس پہلو کو ہم ان کا اجتہادی کردار کہتے ہیں، وضاحت سے پیش کیا جائے۔